صریر خامہ
SAREER A KHAMA
TAFHEEM RESEARCH CENTRE
Category Y
ISSN Online: 3005-947X
ISSN Print: 3005-9461
Vol: 04, Issue 01 (January-April 2025)

سیرتِ نبوی ﷺ پر منٹگمری واٹ کے افکار و آراء کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

A Critical Study of Montgomery Watt's Views on the Seerah of Holy Prophet Muhammad (PBUH)

Sidra Zulfiqar
M. Phil Scholar, Department of Islamic Studies, University of Okara
Email: sidrarao897@gmail.com
Dr. Anwar Ullah
Lecturer, Department of Islamic Studies, University of Okara
Email : Dr.anwarullah@uo.edu.pk

Abstract
This research article critically examines the views of Montgomery Watt on the Seerah (biography) of the Holy Prophet Muhammad (PBUH), focusing on his works *Muhammad at Mecca* (1953) and *Muhammad at Medina* (1956). The study explores Watt's methodological approach, which, while attempting to present a balanced perspective, often relies on secular and materialistic frameworks, thereby marginalizing the spiritual and divine dimensions of prophethood. The article probes Watt's interpretations of key events in the Prophet's life, such as the first revelation, the Hijrah (migration), and interactions with Quraysh, highlighting inconsistencies and biases in his analysis. It investigates how Watt's skepticism toward certain historical narratives contrasts with established Islamic sources, including the Quran and Hadith. The research also explains the broader context of Orientalist scholarship, emphasizing how Watt's work, despite its relative objectivity, remains influenced by Western academic traditions and fails to fully grasp the transcendental aspects of the Prophet's mission. By scrutinizing Watt's arguments, the study underscores the necessity of approaching the Seerah from an Islamic epistemological framework to preserve its authenticity and universality.

Keywords: *Montgomery Watt, Seerah, Orientalism, Critical Study, Prophethood, Islamic Scholarship, Historical Analysis, Biographical Research, Divine Revelation, Methodology.*

حضرت محمد ﷺ کی حیاتِ مبارکہ ہمیشہ سے نہ صرف مسلم علماء و محققین بلکہ مغربی اہل علم کے لیے بھی تحقیق و مطالعہ کا موضوع رہی ہے۔ مغربی محققین میں ولیم منٹگمری واٹ (1909-2006) ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں جن کی مشہور تصانیف Muhammad at Mecca (1953) اور Muhammad at Medina (1956) کو سیرت نگاری میں اہم حوالہ سمجھا جاتا ہے۔ واٹ نے سابقہ مستشرقین کی معاندانہ اور متعصبانہ روایات سے ہٹ کر نسبتاً متوازن انداز میں سیرت نبوی کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان کی تحریروں نے مغربی سیرت نگاری میں ایک نئے رجحان کی بنیاد رکھی جس میں نبی اکرم ﷺ کو ان کے تاریخی و سماجی و سیاسی پس منظر کے تناظر میں سمجھنے کی سعی کی گئی۔ تاہم ان کی تحقیقات طریقۂ کار کی بعض خامیوں اور تعصبات سے خالی نہیں۔ واٹ نے تاریخی و تنقیدی منہج اور سیکولر مفروضات کی بنیاد پر وحی نبوت اور مذہبی محرکات کی تعبیر کی جس کے نتیجے میں وہ کئی روحانی اور آفاقی پہلوؤں کو محض مادی اور معاشی عوامل تک محدود کر دیتے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے رسول اکرم ﷺ کے خلوص، دیانت اور اعلیٰ اخلاقی اوصاف کا اعتراف کیا لیکن ساتھ ہی ان کی نبوی دعوت کے بعض پہلوؤں کو سیاسی و سماجی عوامل کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی۔

منٹگمری واٹ نے سیرت پر دو کتابیں لکھیں ہیں؛ Muhammad at Mecca (1953) اور Muhammad at Medina (1956) مگر یہاں صرف ایک ہی کتاب Muhammad at Mecca کو مطالعہ اور تنقید کا موضوع بنایا گیا ہے کیونکہ دونوں کتابوں کا اندازِ تحقیق ایک ہی ہے۔

سیرت طیبہ اپنی جزئیات اور تفصیلات میں غیب و شہود کی یکجائی کے ساتھ اسلامی عقائد کی عملی ترجمانی اور تاریخی تنقید ہے۔ اُس نے آخری پیغام الٰہی ہونے کی حیثیت سے تحریف شدہ مسیحیت کی ساری راہیں مسدود کر دی ہیں، اور اس کی جگہ ایک سرمدی متحرک اور کامل ترین نظام فکر و عمل پیش کیا ہے۔ یہی وہ حد فاصل ہے جس نے مستشرقین کو سیرت کے فہم صحیح سے محروم رکھا ہے اگرچہ انھوں نے منطقی تجزیہ اور تکنیکی انداز تحقیق اپنانے اور غیر جانبداری برتنے کے دعوے کیے ہیں۔ ایک مستشرق لامانس کی طرح سخت متعصب ہو یا بندلی جوزی کی طرح حیات و کائنات کے بارے میں مادہ پرستانہ تصورات رکھتا ہو اس کی تحریروں کو تحقیق کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ یہ مستشرقین دراصل علم اور تحقیق کے نام سے مذہبی مقدسات کے ساتھ کھلواڑ کرتے ہیں، اور سیرت کو مغرب کی تنقیدی عقل کے لیے تجربہ اور تجزیہ کے مواد کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔[1]

برطانوی مستشرق منٹگمری واٹ (Montgomery watt) نے ایسی ہی ایک نئ تکنیک اپنائی ہے۔ اس نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ اس کو اپنے مطالعات میں ایک ایسے نئے محقق کا درجہ دیا جائے جس نے اپنے آپ کو پیش رو اور معاصر مستشرقین کی غلطیوں سے محفوظ رکھا ہو۔ بلکہ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر سیرت کی غیبی بنیادوں کے بارے میں

[1] Montgomery Watt-، *Mohammed at Mecca*، عربی ترجمہ از شعبان برکات، مطبوعہ المكتبة العصرية بیروت، ص:166-178، 183-189، 223-225

غیر جانبداری اور احترام کا موقف اپنایا ہے۔ اپنی کتاب "محمد ایٹ مکہ (Mohammed at Mecca) کے مقدمہ میں وہ لکھتا ہے کہ جو فقہی مسائل مسیحیت اور اسلام کے درمیان اختلافی ہیں ان میں میں نے غیر جانبداری برتنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح جب قرآن سے استشہاد کا موقع ہوتا ہے تو ارشاد باری ہے یا محمد فرماتے ہیں کے الفاظ استعمال کرنے سے میں نے گریز کیا ہے۔ ایسے موقع پر میں نے "قرآن کہتا ہے" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔۔۔۔ میں اپنے مسلمان قارئین سے بھی اسی وجہ سے ملتی جلتی ایک بات کہوں گا اور وہ یہ ہے کہ مغرب میں تاریخی تحقیق کی جو تکنیک رائج ہے اس کی صحت میں فیصلہ دینے کے با وجود میں کوئی ایسی بات نہیں کہوں گا جو اسلام کے بنیادی عقائد سے ٹکرائے۔[2]

مشہور برطانوی مستشرق ہیملٹن گب (H.A.R.Gibb) نے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ کتاب قاری کے ذہن میں یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ اس کے مصنف نے کسی بھی سابق مصنف کے مقابلہ میں اپنے فکر و خیال میں مکہ میں محمد ﷺ کے تجربہ کے ساتھ زیادہ وقت گزارا ہے۔ مزید برآں تحقیقی معلومات کو ترتیب دینے میں باریک بینی سے کام لیا گیا ہے جس کو اسلام کی بنیادوں کے مطالعہ میں ایک قابل قدر نیا اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ کتاب میں قرآن کے مذہبی نظریات کی معاشی اور معاشرتی بنیادوں پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ اس لیے کتاب سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اس کے عظیم قائد کی حق شناسی کے سلسلہ میں مغرب میں جو کاوشیں انجام پائیں ان کے مقابلہ میں یہ کتاب زیادہ مؤثر ثابت ہوگی۔[3]

منٹگمری واٹ کی اس کتاب کو ہم نے اسی وجہ سے موضوع بحث بنایا ہے۔ دوسرے مستشرقین کی تحقیقات کے مطالعہ اور تنقید کا کام واٹ کے مقابلہ میں انجام پایا ہے۔ حالانکہ ان کی کتابیں سنجیدہ مطالعہ کی بعض شرطوں سے عاری ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دوسروں کی غلطیوں اور تاریخ کو مسخ کرنے کی کوششوں کا تنقیدی مطالعہ کرنے سے بہتر اور اہم کام تو یہ ہے کہ مثبت اور تعمیری کام کیا جائے کیونکہ ہماری تاریخ اور تہذیب کے بہت سے گوشے تا حنوز تشنہ تحقیق ہیں، مگر دفاعی مطالعات اس شرط کے ساتھ اہمیت اور افادیت کے حامل ہو جاتے ہیں کہ عقیدہ یا تاریخ کے پہلوؤں کو مثبت انداز سے آشکارا کر دیا جائے جن کے سامنے مخالفین کی غلط بیانیاں بے حقیقت معلوم ہو جائیں۔[4]

مغرب میں مطالعہ سیرت کا ارتقاء

مونیس نیور کوئی اپنی کتاب "دین حق کی جستجو میں لکھتا ہے: "مشرق میں ایک نیا دشمن پیدا ہوا، یعنی اسلام جس کی بنیاد ہی طاقت کے استعمال اور بے انتہا تعصب پر ہے۔ محمد نے اپنے پیروکاروں کو تلوار دی، مقدس اخلاقی روایتوں کا لحاظ نہ رکھا اپنے پیروکاروں کو بدی اور لوٹ مار کی اجازت دی۔ جنگ میں ہلاک ہونے والوں سے بہشت میں دائمی لطف ولذت کے

---

[2] - Montgomery Watt، *Mohammed at Mecca*، عربی ترجمہ از شعبان برکات، مطبوعہ المکتبۃ العصریۃ بیروت، ص 5-6

[3] - ایضاً، ص 7

[4] - ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ندوی، فصول في المنهج والتحليل، فصل تداول السلطة في العصر الاموی، مطبوعہ المکتبۃ الاسلامی بیروت، 1980ء

وعدے کیے۔ کچھ ہی عرصوں میں ایشیاء کو چک افریقہ اور اسپین ان کا شکار ہو گئے۔ اٹلی تک کو اُن سے خطرہ ہو گیا۔ اس آندھی نے آدھے فرانس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شہر میں یہ آفت آچکی تھی۔ مگر مسیحیت نے شارلمان کی تلوار کے ذریعے بواسیہ کے پاس (۷۵۲ھ) اسلام کی فتوحات کا راستہ روک دیا۔ پھر تقریباً دو صدیوں (۱۰۹۹ تا ۱۲۵۴ء) تک صلیبی جنگوں کا سلسلہ جاری رہا۔ یورپ ہتھیاروں سے مسلح ہو گیا اور مسیحیت کو نجات ملی۔ صلیبی پرچم کے سامنے ہلالی طاقت پسپا ہو گئی۔ انجیل کو قرآن اور اس کی عام اخلاقیات پر فتح حاصل ہوئی۔[5]

موسیو کیمون اپنی کتاب تھیالوجی آف اسلام میں کہتا ہے: "دین محمدی ایک کوڑھ ہے جو لوگوں میں پھیلا اور ان کو تباہ کرتا چلا گیا۔ بلکہ خوفناک مرض ایک عمومی فالج اور دماغی پاگل پن ہے جو انسانوں میں سست روی اور پژمردگی پیدا کر دیتا ہے اور ان میں اگر بیداری بھی آتی ہے تو صرف خونریزی اور شراب نوشی کے لیے۔ اس سے وہ برائیوں کے خوگر بن جاتے ہیں۔ مکہ میں محمد ﷺ کی قبر کیا ہے؟ ایک بجلی گھر ہے جو مسلمانوں کے ذہنوں میں جنون پھیلاتا ہے۔ اس کی وجہ سے ان پر جب ہسٹریائی دورے پڑتے ہیں تو دماغی باؤلے پن میں اللہ اللہ کی رٹ شروع کر دیتے ہیں۔ اسلام چند باتوں کو انسان کی فطرت ثانیہ بنا دیتا ہے جیسے خنزیر کے گوشت اور شراب موسیقی سے نفرت اور طبیعتوں کو سختی اور تعیش کی زندگی کا عادی بنا دیتا ہے۔[6]

جو یلیان اپنی کتاب "تاریخ فرانس میں رقمطراز ہے: "مسلمانوں کے مذہب کے بانی محمد ﷺ نے اپنے پیروکاروں کو حکم دیا ہے کہ دنیا کو زیر کرتے ہوئے تمام مذاہب کی جگہ اسلام کو رائج کر دیں۔ ان بت پرستوں اور عیسائیوں میں کتنا زبردست فرق ہے عربوں نے طاقت کے بل بوتے پر اپنے مذہب کو مسلط کر دیا اور لوگوں سے کہا کہ اسلام لاؤ یا مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ مسیح کے پیروکاروں نے نیکی اور حسن سلوک کے ذریعے سکون بخشا عربوں کا اگر ہم پر غلبہ ہو جاتا تو دنیا کا کیا حال ہوتا؟ تب تو ہم بھی الجزائر اور مراکش کے لوگوں کی طرح مسلمان ہوتے"۔[7]

ڈاکٹر گلور نے اپنی کتاب "عالمی عیسائی مشنریوں میں پیش رفت (جو ۱۹۶۰ء میں نیویارک سے شائع ہوئی) میں لکھا ہے کہ: "محمد ﷺ کی تلوار اور قرآن کی تہذیب سچائی اور آزادی کے سب سے بڑے دشمن یہی ہیں۔ یہ ایسے تباہ کن عوامل میں سے ہیں جن سے دنیا اب واقف ہوئی"۔[8]

ڈاکٹر گلو وراب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو نشانہ بناتے ہوئے لکھتا ہے کہ: "محمد ﷺ ایک مطلق العنان حاکم تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ بادشاہ کا یہ حق ہوتا ہے کہ رعایا اس کی خواہشوں کی پیروی کریں۔ یہ خیالات ان کے دل و دماغ پر پوری طرح حاوی تھے۔ ان کا یہ عزم تھا کہ ایسے تمام لوگوں کا سر قلم کر دیا جائے جو ان کی مخالفت پر آمادہ ہوں۔ ان کا

---

[5] ۔ ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ندوی، علوم اسلامیہ اور مستشرقین، مطبوعہ میٹرو پرنٹرز لاہور، 2009ء، ص 75

[6] ۔ ایضاً

[7] ۔ ایضاً، ص 76

[8] ۔ ایضاً

عربی لشکر دھمکیاں دینے اور ظلم وزیادتی کرنے کے لیے بے چین رہتا تھا۔ رسول نے ان کو ہدایت دی تھی کہ ہر اس شخص کو قتل کر دیا جائے جو ان کی بات ماننے سے انکار کر دئے اور ان کے راستہ پر چلنے کے لیے تیار نہ ہو"۔[9]

سفاری جس نے ۵۲ ۷ھ میں قرآن کا ترجمہ کیا تھا، یہ لکھتا ہے کہ محمد ﷺ نے خداوندی اقتدار کا سہارا لیا تھا کہ لوگ اس عقیدہ کو تسلیم کریں۔ چنانچہ انھوں نے مطالبہ کیا کہ لوگ ان کو خدا کا رسول مانیں اور ان پر ایمان لائیں، حالانکہ یہ جھوٹا عقیدہ ان ہی کی عقل کا ساختہ پرداختہ تھا۔[10]

یہ اقتباسات اس بات کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ مستشرقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کسی طرح کا نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ دراصل یہ نقطہ نظر اسلام اور صلیبی طاقتوں کے درمیان تصادم کا نتیجہ ہے۔ صلیبی جنگوں کی تلخ یادیں اہل مغرب کے لیے ہمیشہ سوہان روح بنی رہیں۔ جرمن نو مسلم محمد اسد (لیوپولڈ وائس) اس تجربہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جو مغربی فضلاء کے طریقوں میں ایک پیچیدہ تھی بن کر رہ گیا تھا: "اسلام کے بارے میں روایتی تحقیر ایک غیر معتدل فرقہ پرستی کی شکل میں ان کے مطالعات میں سرایت کرنے لگی۔ یورپ اور عالم اسلام کے درمیان صلیبی جنگوں نے جو خلیج پیدا کر دی تھی اس کو پاٹا نہیں جاسکتا۔ پھر اسلام سے نفرت یورپی فکر کا بنیادی حصہ بن گئی۔ دراصل ابتدائی مستشرقین دور ہائے جدید میں وہ مسیحی مبلغین تھے جنھوں نے عالم اسلام میں مشنری سرگرمیوں کو فروغ دیا۔ اسلام کی تعلیمات اور تاریخ کی شکل کو جس طرح انھوں نے بگاڑا تھا اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ بت پرستوں کے سلسلہ میں اہل یورپ کے نقطہ نظر پر اثر ڈالا جائے۔ استشراق اگرچہ بعد میں مشنری نفوذ سے آزاد ہو گیا البتہ روایتی عقل کا انحراف باقی رہا۔ اب مستشرق کے پاس ایسا کوئی عذر نہیں ہے جس سے اب تک مذہبی تعصب کے باقی رہنے کی وجہ معلوم ہو سکے۔ اسلام پر مستشرقین کی یورش ایک موروثی عادت بن چکی تھی، جس کی بنیادیں صلیبی جنگوں اور ان کے مضمرات نے فراہم کی تھیں۔[11]

جرمن مستشرق بیکر لکھتا ہے مسیحیت کی اسلام سے دشمنی اس لیے ہے کہ عہد ہائے وسطی میں اسلام کی اشاعت نے مسیحیت کی راہ سختی سے روک دی تھی اور اسلام ان علاقوں میں پھیل گیا تھا جہاں کلیسا کا اثر و نفوذ تھا۔[12]

مستشرقین کی غلطیوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو تین قسم کی بنیادی غلطیاں نظر آتی ہیں جو دوسری بہت ساری غلطیوں کی منبع و مآخذ ہیں۔

مستشرقین کی پہلی غلطی یہ ہے کہ وہ شک وشبہ پیدا کرنے میں مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں۔ شک وشبہ پیدا کرنے میں مبالغہ سے کام لینا مفروضے قائم کرنا حقائق کا کیفیاتی انکار اور ضعیف روایتوں پر اعتماد کرنا۔ ڈاکٹر جواد علی کے الفاظ میں:

---

[9] ۔ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ندوی، علوم اسلامیہ اور مستشرقین، مطبوعہ میٹرو پرنٹرز لاہور، 2009ء، ص77

[10] ۔ایضاً

[11] ۔ایضاً

[12] ۔ایضاً، ص78

مستشرقین نے سیرت پر اپنے مطالعات میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور اس کے واقعات اور حقائق میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی بے پناہ کوشش کی ہے۔ اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تک میں شک کر بیٹھتے، کیونکہ آپ کے اسم گرامی میں تو خیر انھوں نے شک کرنے کی کوشش کی بھی۔ مستشرقین سیرت کے بارے میں جو بھی نتیجہ تحقیق پیش کریں یہ حقیقت بہر حال روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ آپ کی سیرت دوسرے تمام انبیاء کی سیرتوں کے مقابلہ میں زیادہ صحیح واضح اور بین الثبوت ہے۔[13]

درمنگھم جو خود بھی مستشرق ہے مستشرقین کی اس عام روش کا اعتراف کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ: "واقعی یہ بات افسوس ناک ہے کہ میور نولدکے اسپرنگر دوزی کیتانی مارسین، گریم گولڈ زیہر گوڈ فریں جیسے ماہر مستشرقین نے تنقید میں غلو سے کام لیا ہے۔ ان کی کتابیں خاص طور پر تخریبی رنگ کی حامل رہیں، جن نتائج تک مستشرقین پہنچے وہ سب سلبی اور ناقص ہیں۔ حالانکہ سلبی انداز سے کوئی سوانح مرتب نہیں کی جاتی۔ میری اس کتاب میں ان متضاد تحقیقات کا جائزہ لینا مقصود نہیں ہے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ پادری یومانس بھی کچھ زیادہ ہی تعصب پرست نظر آتا ہے۔ حالانکہ اس کو دور جدید کے بہترین مستشرقین میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنی بہترین کتابوں کو بھی اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف نفرت سے داغدار کر دیا ہے۔ چنانچہ اس مسیحی فاضل کے نزدیک حدیث اگر قرآن کے موافق ہو تو اسے قرآن ہی سے ماخوذ سمجھا جائے گا، اگر دو موافق دلیلوں کو ناقابل اعتبار ٹھہرایا جائے تو مجھے نہیں معلوم کہ پھر تاریخ کیوں کر لکھی جاسکتی ہے۔[14]

بعض مستشرقین قرآن کو مطالعہ سیرت کے لیے ایک بنیادی مرجع قرار دیتے ہیں۔ مگر اس طرح وہ قرآن کو دو دھاری تلوار کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن کو مرجع ٹھہرا کر مستشرقین نے سیرت کے ان تمام واقعات کا انکار کر دیا ہے جن کا تذکرہ قرآن میں نہیں ملتا حالانکہ قرآن تاریخ یا سیرت کی کوئی کتاب نہیں ہے خصوصاً ایسے واقعات کا اگر قرآن میں تذکرہ نہیں ملتا جن سے رسول کی عظمت ثابت ہو اور ان کے انکار سے مستشرقین کا کوئی مطلب حل ہو رہا ہو تو وہ بے دھڑک ان کا انکار کر دیتے ہیں، مثال کے طور پر اسپرنگر (sprenger) کا خیال ہے کہ نبی کا نام قرآن کی چار سورتوں آل عمران احزاب، محمد اور فتح میں وارد ہوا ہے یہ ساری سورتیں مدینہ میں نازل ہوئیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہجرت سے پہلے "محمد" کا لفظ رسول کے نام کے طور پر مستعمل نہیں تھا۔ انجیل کا مطالعہ کرنے اور مسیحیوں سے روابط قائم کرنے کے بعد ہی انھوں نے اپنے لیے اس کا انتخاب کیا۔[15]

مستشرقین کی دوسری بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ تاریخ کے واقعات کو خود ساختہ سیکولر نقطہ نظر اور معاصرین کے تناظر میں دیکھنا چاہتے ہیں، اے تین دینے Etienne Dinet کے بقول: مستشرقین کے لیے اپنے ماحول جذبات اور

13۔ بروکلمان، تاریخ الشعوب الاسلامیہ، ترجمہ فارس اور بعلبکی، مطبوعہ دار العلم للملایین، 1968ء، ص 63-64

14 ۔ ولفنسن، تاریخ الیھود فی بلاد العرب فی الجاھلیة و صدر الاسلام، مطبعة الاعتقاد القاھرہ، 1937ء، ص 135-137

15 ۔ جواد علی، تاریخ العرب قبل الاسلام، مطبوعہ بغداد، 1916ء، ج 1، ص 78 اور حواشی۔

رجحانات سے کنارہ کش ہونا بے حد مشکل بلکہ ناممکن ہے اس وجہ سے نبی اور صحابہ کے حالات پر قلم اٹھاتے وقت انھوں نے اس قدر تعریفیں کی ہیں کہ ان کی اصل تصویر ہی نظروں سے اوجھل ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ لوگ اگرچہ تنقید کے منصفانہ اصولوں اور تحقیق کے علمی طریقہ کار پر کاربند ہونے کے دعوے کرتے ہیں لیکن ان کی تحریروں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ محقق اگر جرمن ہے تو رسول جرمن اسلوب میں گفتگو کر رہے ہوتے ہیں۔ محقق اگر اطالوی ہے تو رسول کا طرز کلام بھی ان ہی جیسا ہے اس طرح محقق کی شہرت کے لیے رسول کی شخصیت بدل جاتی ہے۔ ان کی تحریروں کے آئینہ میں رسول کی اصل تصویر نہیں ابھرتی بلکہ ایک ایسی افسانوی تصویر نظر آتی ہے جو حقیقت حال سے ان کہانیوں سے بھی زیادہ دور ہے جو والٹر اسکاٹ یا اسکو د یماس نے ترتیب دی ہیں۔ مستشرقین سیرت کے حقیقی خدوخال نہیں دیکھ سکتے۔ انھوں نے مغربی منطق اور عصری تناظر میں اس کو دیکھنے کی کوشش کی اے تین دینے ایک برعکس مثال دے کر مسئلہ کی اس طرح وضاحت کرتا ہے کہ اقصائے چین کا ایک شخص اگر ان تضادات کا جائزہ لے جو فرانسیسی مستشرقین کے یہاں بکثرت ملتے ہیں اور مشرق بعید کے آئینہ میں ان کی چھان بین کرے کار دنیال ریشلیو کی ان بنیادوں کو ختم کر دے جن سے ہم واقف ہیں تاکہ ریشلیو کی ایسی تصویر ابھر کر سامنے آئے جو بیکن نے پیش کی ہے ایک کاہن کا مزاج اور خصوصیات رکھنے والا ریشلیو تو یورپ والے اس تصویر کو دیکھ کر کیا رائے قائم کریں گے؟ دور جدید کے مستشرقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت لکھنے میں اسی طرح غلط نتائج اخذ کیے ہیں۔ ان کو پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ فرانسیسی مستشرقین کی تحریروں میں محمد عربی کے بجائے جرمن فرانسیسی یا انگریزی لب ولہجہ میں گفتگو کر رہے ہیں۔ یہ فرانسیسی مستشرق جس نے اسلام قبول کر لیا تھا آخر میں یہ لکھتا ہے ہمارے جلیل القدر نبی کی شخصیت روایتوں کے آئینہ میں نہایت ہی بلند اور ان ہی بلند اور ارفع ہے اس مصنوعی شخصیت کے مقابلہ میں جس کو اہل مغرب نے اپنی درس گاہوں میں بڑی جدوجہد کے بعد دھندلا کر دیا ہے۔[16]

ڈاکٹر جواد علی نے اطالوی مستشرق کیانی کے بارے میں صحیح لکھا ہے کہ اس کا انداز تحقیق بالکل ہی معاندانہ ہے۔ وہ حقائق کو توڑ مروڑ کر مطلوبہ نتائج نکالنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اس کو اس بات کی قطعی فکر نہیں ہوتی کہ جن کمزور روایتوں کو بنیاد بنا کر مطلوبہ نتائج اخذ کرتا ہے وہ کسی بھی حال میں قابل استدلال نہیں ہیں۔[17]

اے تین دینے کی کتاب مشرق مغرب کی نظر میں میں کچھ ایسے خیالات مل جاتے ہیں جن سے مذکورہ انداز تحقیق پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے کہ ڈاکٹر ہورخرونیہ (Snouck Hurgronje) نے صحیح لکھا ہے کہ محمد ﷺ کے جدید سوانح یہ ثابت کرتے ہیں کہ ایسی تاریخی تحقیقات بے نتیجہ ہیں جن کو کسی خاص پیشگی نقطہ نظر یا تصور کے تابع بنا دیا گیا ہو۔ اس دور کے مستشرقین کو یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے تاکہ وہ پیشگی تصورات کو صحیح ثابت کرنے کے مرض سے محفوظ رہ سکیں کسی

---

[16] دیکھیے: William Muir, *The Caliphate: Its Rise, Decline and Fall, London*, 1891, Pg 43-44 بحوالہ آرنلڈ: الدعوة الی الاسلام، ترجمہ حسن ابراہیم حسن، القاہرہ، 1971ء، ص 49-50۔

[17] آرنلڈ، الدعوة الی الاسلام، ص 48

نقطہ نظر کی تائید کرنے کے لیے ان کو بعض ایسی روایتوں کی تردید کرنا پڑتی ہے جن کی تردید آسان نہیں ہے۔ اس تردید سے جو خلاء پیدا ہو جاتا ہے اس کو پر کرنے کے لیے نئی باتیں پیدا کرنا ہوتی ہیں جو ناممکن ہے۔ بیسویں صدی کے کسی بھی دانشور کے لیے یہ ضروری ہے کہ اصل حقیقتوں تک پہنچنے کے بنیادی اسباب سے واقف ہو جیسے زمانہ ماحول علاقہ رسوم و رواج ضرورتیں، رجحانات حوصلہ وغیرہ۔ خاص طور سے ان اندرونی قوتوں کا علم رکھنا ضروری ہے جن کو کسی عقلی پیمانہ پر ناپا نہیں جاسکتا اور جن کے اثرات فرد اور گروہ دونوں کی سرگرمیوں پر بہت ہوتے ہیں۔[18]

طیباوی نے مستشرقین کی ذہنیت اور اس میں کارفرما مذہبی محرکات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ مسیحیت اور اسلام میں کئی موقعوں پر یکسانیت محسوس ہوتی ہے۔ اسلوبیاتی پیچیدگی اور اسلام دشمنی (جو استشراقی فکر کے نمایاں عیوب میں سے ہے) کی بدولت مستشرقین کے لیے صحیح معنوں میں سیرت فہمی ممکن نہ ہو سکی۔ غیر جانبداری ان میں سرے سے معدوم ہوتی ہے مارگولیوتھ ولہاؤزن اور بروکلمان جیسے اہم مستشرقین کے یہاں بھی یہ عیب نمایاں ہے۔ مثال کے طور بروکلمان ایک جگہ لکھتا ہے: "کچھ ہی عرصہ کے بعد محمد ﷺ اور علماء یہود میں اختلافات پیدا ہو گئے اس دور افتادہ خطہ میں اگرچہ ان کے پاس زیادہ علم نہیں تھا تاہم وہ رسمی علوم اور زیرکی میں نبی امی ﷺ سے بڑھے ہوئے تھے۔[19]

مارگولیوتھ کا بھی وہی انداز ہے۔ اس کے نزدیک خیبر کے یہودیوں کے خلاف مسلمانوں کی کارروائی ایک صریح زیادتی تھی۔ مارگولیوتھ لکھتا ہے کہ مدینہ میں آپ نے شروع میں یہودیوں کے ساتھ بالکل مسلمانوں کی طرح برتاؤ کرنے کا اعلان کیا، مگر یہ طرز عمل چھ سال بعد بالکل ہی بدل گیا۔ اب کسی گروہ پر حملہ آور ہونے کے لیے صرف یہ بات کافی تھی کہ وہ غیر مسلم ہے۔ مسلسل فوجی کارروائی کے بارے میں محمدؐ کے جذبات وہی ہو۔ ہو گئے تھے جو ہمیں ان سے پہلے اسکندر یونانی اور بعد میں نپولین کے یہاں نظر آتے ہیں۔ خیبر پر محمد کے قبضہ سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اسلام اب پوری دنیا کے لیے کس حد تک خطرہ بن گیا تھا۔[20]

بندلی جوزی کا کہنا ہے کہ مکہ یا مدینہ میں نبی عربی کا کبھی یہ ارادہ نہ رہا کہ برائی کے معاشرتی جراثیم کا خاتمہ کر دیا جائے جس طرح سے آج کی کمیونسٹ پارٹیاں یہ کام انجام دے رہی ہیں۔ نبی عربی کے سامنے بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ پیداوار کی تقسیم سے بعض طبقے جن پریشانیوں کے شکار تھے ان کو کسی حد تک کم کر دیا جائے یعنی وہ طبقے جو حالات کا مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے فقر اور غلامی کا شکار ہو گئے ہیں۔ نبی عربی اگر تمام معاشرتی بیماریوں کی بیخ کنی کرنا چاہتے تو جزیرہ نمائے عرب میں برسر اقتدار ہونے کے بعد مذکورہ طریقوں کے علاوہ دوسرے وسائل سے بھی کام لیتے اس پہلو سے نبی عربی کا حال تو دوسرے نبیوں سے مختلف نہیں ہے۔ انھوں نے ادبی وسائل کو ان وسائل پر ترجیح دی جن سے ہمارے زمانے میں یورپ کے سیاسی قائدین اور

18۔ آرنلڈ، الدعوۃ الی الاسلام، ص48

19۔ دیکھیے: Margoliouth, *Mohammed and The Rise of Islam*, London, 1905, Pg 262-263

20۔ ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ندوی، علوم اسلامیہ اور مستشرقین، ص86

مصلحین کام لیتے ہیں۔ جیسے لینن، مسولینی وغیرہ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ محمد نے عربوں کی سماجی اور معاشرتی بیماریوں کی تشخیص اور ان کی تعداد بیان کرنے میں اگرچہ بہتر کارکردگی کا ثبوت دیا، لیکن ایسی کوئی کارکردگی ان کے علاج یا جراثیم کی بیخ کنی کے سلسلہ میں نہیں ملتی۔[21]

منٹگمری واٹ اگرچہ دوسرے مستشرقین کے مقابلہ میں اصول تحقیق کے معیار کو قائم رکھنے میں زیادہ ممتاز نظر آتا ہے اور بڑی حد تک غیر جانبداری کا بھی ثبوت دیتا ہے البتہ اپنے پیش رو اور معاصر مستشرقین کی طرح بسا اوقات اس پر تنقیدی ذوق کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ مقدمہ کتاب میں اس نے جس معروضیت پسندی پر قائم رہنے کا وعدہ کیا تھا اس پر عمل کرنے میں وہ ناکام رہا اور بارہا اصول تحقیق سے انحراف کیا، فروعی مسائل سے گریز کرتے ہوئے ہم ذیل میں واٹ کے اصول تحقیق سے انحراف پر بحث کریں گے۔[22]

منٹگمری واٹ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش اور حضرت خدیجہ سے آپ کی شادی کے درمیانی عرصہ میں جو اہم واقعات پیش آئے ان کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے شادی سے پہلے ان واقعات سے محمد کی زندگی پوری طرح متاثر رہی۔ ایک مورخ کے نقطہ نظر سے چند باتیں غور طلب ہیں۔ اس کے علاوہ بڑی تعداد میں ایسی روایتیں موجود ہیں جن کی نوعیت فقہی ہے لیکن ایک مورخ کے نزدیک وہ صحیح نہیں ہیں۔ کیونکہ ان میں ایسے واقعات بھی شامل ہیں جن کو محمد کی زندگی کے مختلف ادوار سے منسوب کیا جاسکتا ہے البتہ اپنے مفہوم کے لحاظ سے پرہیزگار مسلمانوں کے لیے یہ روایتیں محمد کے مقصد کو پورا کرتی ہیں اس طرح ان کو صحیح قرار دیا جاسکتا ہے وہ نبی کی زندگی کے شایان شان ایک ضمیمہ ہو سکتی ہیں، وہ سب عقیدت مندی کی پیداوار ہیں، بہر کیف اس جگہ ہم ابن الحلق کی روایت کے مطابق زیادہ مشہور واقعات ہی کو بیان کریں گئے۔[23]

واٹ نے ابن اسحق کی روایت کے مطابق دو فرشتوں (شق صدر) اور بحیرہ راہب کے واقعات کو ذکر کیا ہے اور یہ تنقید کی ہے کہ نبی کی پیدائش اور شادی کے درمیان ایک چوتھائی صدی کے عرصہ میں جو واقعات پیش آئے ان کے لیے ایک قاری کو ٹھوس بنیادیں نہیں ملتیں۔ مگر سوال یہ ہے بحیرہ راہب کا واقعہ اگر محل نظر ہے اور تنقید کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا۔[24] تو دونوں فرشتوں کے ذریعے شق صدر کے واقعہ کا کیوں انکار کیا جارہا ہے حالانکہ "ابن ھشام"[25] "ابن سعد"[26] اور "بلاذری"[27]

---

21 ۔ محمد ایٹ مکہ، ص66۔

22 ۔ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ندوی، دراسة فی السیرة، بیروت، 1981ء، ص271-271

23 ۔ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ندوی، علوم اسلامیہ اور مستشرقین، ص92

24 ۔ ایضاً، ص92

25 ۔ ابن ہشام، تہذیب سیرة ابن ہشام، از عبد السلام ہارون، القاہرہ، 1948ء، ص32-31

26 ۔ محمد بن سعد البصری، طبقات ابن سعد، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، 1990ء، ج1، ص74-70

27 ۔ بلاذری، انساب الاشراف: تحقیق محمد حمید اللہ، مطبوعہ معہد المخطوطات لجامعة الدول العربیہ، 1959ء، ج1، ص82-81

جیسے سیرت نگاروں اور مورخین کے علاوہ "امام مسلم" اور "امام احمد" جیسے محدثین نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔ مزید بر آں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس واقعہ کا تعلق نبیی سر چشمہ سے ہے جس کے بعد نبی کی ذات تاریخ کے عقلی تجزیہ سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ ام المومنین حضرت خدیجہ سے سات بچے پیدا ہوئے واٹ کا اس پر اشکال یہ ہے کہ حضرت خدیجہ سے اگر ہر سال ایک بچہ کی پیدائش فرض کرلیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ آخری بچہ کی پیدائش کے وقت ان کی عمر 48 برس ہو گئی ہو گی۔ یہ بات ناممکن تو نہیں مگر حیرت انگیز ضرور ہے جس پر رائے زنی کی جاسکتی ہے یہ ایسی بات ہے جسے بعد میں معجزہ قرار دیا جاسکتا ہے۔[28]

حضرت خدیجہ کی عمر شادی کے وقت چالیس سال سے کچھ کم رہی یا پورے چالیس سال یہ بات ہر کسی کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ پچاس سال کی عمر تک تولید کی صلاحیت پائی جاسکتی ہے۔ پھر حضرت خدیجہ کے مسئلہ میں کیا پیچیدگی ہے؟ لیکن واٹ کا نقطہ نظر دیکھیے ہم کو اس موقع پر ابن ھشام طبری اور ابن سعد کسی کی یہاں کوئی رائے زنی نہیں ملی۔[29] دعوت اسلامی کے آغاز پر بحث کرتے ہوئے واٹ لکھتا ہے: "محمد کی دعوت کے زمانہ میں جو حالات تھے ان کے بارے میں بڑی بے اطمینانی کا احساس ہوتا ہے۔ قدیم ترین روایتوں کی چھان بین سے ایک قابل اعتماد تصویر بنائی جاسکتی ہے اگرچہ اس کی تفصیلات اور تاریخی وسائل کمزور اور ناپختہ ہیں۔[30]

پہلی وحی کے بارے میں واٹ ایک دشواری محسوس کرتا ہے وہ دشواری یہ ہے کہ ابتدائی وحی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم کی تفسیر مسلمان یہ کرتے ہیں کہ اس میں قلم کا استعمال مراد ہے، لیکن قلم کا استعمال ہی کیوں کر ہوتا اگر محمد ﷺ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے؟ واٹ کے نزدیک اصل بات یہ ہے کہ محمد ورقہ بن نوفل کے پاس سابق آسمانی کتابوں کا علم حاصل کرنے کے لیے جایا کرتے تھے۔ آپ نے آیت میں ہی اس بات کو دہرا دیا جس کو اس سے پہلے ورقہ سے سیکھ چکے تھے۔ ورقہ نے جس ناموس (فطرت) کی بات کی تھی وہ بھی اپنی جگہ دلچسپ (؟) ہے۔ خود اقرآ سے پہلے کسی وحی کا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے یہ فرض کرلینا بہتر ہو گا کہ محمد ﷺ نے نوعمری ہی سے ورقہ سے تعلقات استوار کرلیے تھے اور ان سے بہت سی باتیں سیکھ چکے تھے۔ اسلام کی بہت سی تعلیمات ورقہ کے افکار سے متاثر ہوئیں۔ اس طرح محمد پر اترنے والی وحی اور کسی سابق وحی کے درمیان رشتہ کا سوال ہمارے سامنے اٹھ کھڑا ہوتا ہے مگر قارئین محسوس کر رہے ہوں گے کہ یہ دشواری واٹ کے تشکیک پسند ذہن کی پیداوار ہے۔ وحی کی ابتداء کا واقعہ مکمل تفصیلات کے ساتھ بخاری میں موجود ہے۔[31]

28۔ محمد ایٹ مکہ، ص 73
29۔ ایضاً
30۔ ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ندوی، علوم اسلامیہ اور مستشرقین، ص 93
31۔ محمد ایٹ مکہ، ص 144

ابتدائی وحی کے بعض پہلوؤں کو واٹ جس طرح رد کر رہا ہے جب کہ ان پر تمام محدثین اور مورخین کا اتفاق ہے اور واٹ جس طرح دوسرے فرضی پہلوؤں سے واقعہ کا تانا بانا جوڑنے کی کوشش کر رہا ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ محض تنقیدی ذوق سے کام لے کر تاریخی واقعات میں شک پیدا کرنا چاہتا ہے ورقہ سے فائدہ اٹھانے کی بات واٹ نے تو کہدی مگر اس کی نہ تو دلیل دینے کی زحمت کی اور نہ ہی استفادہ کے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔[32]

کسی روایت کی تفصیلات اور مستقبل میں ابھرنے والے واقعات کے درمیان اگر یکسانیت محسوس ہوتی ہے تو واٹ اسے بنیاد بنا کر روایت کو مشکوک ٹھہرا دیتا ہے۔ واٹ کو اس یکسانیت اور ہم آہنگی میں کسی شخصیت کے سلسلہ میں عقیدت مندی اور تقدس اور اس کے خیالات کی تشہیر اور طرف داری نظر آتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اسلام میں شرافت کا معیار یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کے معاملہ میں اخلاص برتا جائے۔ اسی لیے مسلمانوں نے عزت اور شرافت کے سلسلہ میں اپنے آباؤ اجداد کا غلط استعمال کیا۔ اس وجہ سے ابتدائی مسلمانوں کے حالات کی چھان بین میں شدید احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر اگر اسلامی مصادر میں کسی بزرگ کے بارے میں اولین دس لوگوں میں سے ہونا بیان ہو تو احتیاط سے یہ سمجھنا چاہیے کہ غالباً وہ ابتدائی پینتیس مسلمانوں میں سے رہے ہوں گے۔[33]

منٹگمری واٹ نے بیعت عقبہ میں حضرت عباس کی موجودگی ہی سے انکار کیا ہے حالانکہ انھوں نے اس بیعت کے وقت اور فتح مکہ کے موقع پر جو کردار ادا کیا تھا وہ تاریخ میں محفوظ اور مشہور ہے۔ واٹ کے نزدیک بعد کے راویوں نے حضرت عباس کی موجودگی کا اضافہ کیا ہے اور مقصد یہ رہا کہ اس زمانہ میں بنو ہاشم نے محمد کے ساتھ جو بدسلوکی کی تھی اس کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا جائے۔ اس واقعہ کو نہ ماننے کی وجہ واٹ نے یہ بیان کی ہے کہ حضرت عباس اس وقت مشرک تھے۔[34] واٹ اس کے بعد شرک کی سنگینی کو کم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ پہلی صدی کے آخر میں عباس محمد کی تعریف کرتے تھے پھر محمد ایک شخص کو اجازت دیتے ہیں کہ مدینہ کے باشندہ عباس کی ان قابل گرفت باتوں کی تردید کر دیں، عقبہ ثانیہ میں عباس کی موجودگی کی داستان گھڑ کر عباسی پروپیگنڈہ میں فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔[35]

قریش نے جس طرح مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے وہ تاریخ، سیرت اور حدیث کی کتابوں میں محفوظ اور مشہور ہیں، لیکن واٹ ظلم و ستم کے ان واقعات کو مبالغہ آرائی ٹھہرا کر مشکوک کر دیتا ہے۔ واٹ کے نزدیک قریش کی طرف سے حریفانہ دباؤ معمولی تھا مسلمانوں نے اگر اس دباؤ کو مبالغہ سے بیان کیا ہے تو دراصل اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ لاکھ ستم کے باوجود کسی نے اسلام کو نہیں چھوڑا ابن اسحق کے حوالہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ محمد گو سب و شتم کا نشانہ بنایا گیا اور معمولی

---

32 ۔ محمد ایٹ مکہ، ص145-146

33 ۔ ایضاً، ص232

34 ۔ ایضاً، ص191-190

35 ۔ ایضاً، ص192

انداز کے اہانت آمیز واقعات پیش آئے جیسے پڑوسیوں کا ان کے گھر کے سامنے کوڑا کرکٹ ڈال دینا۔ ابو طالب کے انتقال کے بعد غالباً پریشان کرنے کا سلسلہ تیز ہو گیا تھا۔[36]

حبشہ کی طرف مسلمانوں کی ہجرت اور ایک زمانہ تک قیام کے بارے میں واٹ کا خیال ہے کہ اس کے پانچ اسباب ہو سکتے ہیں: 1۔ ظالمانہ دباؤ سے بچنے کی کوشش ۲۔ ارتداد کے خطرہ کو ٹالنا ۳۔ تجارتی سرگرمیوں کو جاری رکھنا ۴۔ حبشہ کے باشندوں سے جنگی امداد حاصل کرنے کی جدوجہد واٹ کو جب ان چار باتوں سے ہجرت اور قیام کے تجزیہ سے کوئی افادی پہلو نظر نہیں آتا تو اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے پانچواں سبب یہ بیان کرتا ہے کہ اس وقت اسلام کی نوخیز ملت کے اندرونی معاملات میں فکری خلفشار پیدا ہو گیا تھا۔[37] واٹ نے ہجرت کے اسباب کا جو تجزیہ کیا ہے اس کے برعکس قرآنی آیتوں سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اصل وجہ مشرکوں کی طرف سے بے انتہا ظالمانہ دباؤ تھی۔[38] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وجہ سے مسلمانوں کو ہجرت کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ حضرت ابو بکر بھی ہجرت کے لیے آمادہ ہوئے تھے مگر چونکہ ایک قبیلہ کے سردار نے ان کو اپنی پناہ میں لے لیا تھا اس لیے وہ ہجرت نہ کر سکے۔[39]

"منٹگمری واٹ نے سیرت اور تاریخ کے ایسے واقعات میں بھی شک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جن میں قطعاً چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے مثلاً اس کا خیال ہے کہ محمد ﷺ نے کعبہ میں مورتیوں کی پوجا پر کبھی بھی براہ راست تنقید نہیں کی۔ ہاں اطراف میں جو مورتیاں نصب تھیں، ان پر ضرور تنقید کی گئی۔ واٹ کے نزدیک خود قرآن میں کعبہ کے بتوں پر کوئی تنقید نہیں کی گئی ہے۔ محمد ﷺ اگر کعبہ کے بتوں پر تنقید کرتے تو نتیجہ یہ ہوتا کہ عرب کے باشندے مکہ آنا بند کر دیتے اور اس وجہ سے تجارت ٹھپ پڑ جاتی۔ مکہ کے اطراف میں نصب مورتیوں پر نکتہ چینی کرنے سے ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا۔[40] مگر ان روایتوں کا واٹ کیا جواب دے سکتا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کھل کر بت پرستی کی مخالفت کی اور جس کا قریش کو بھی بخوبی احساس تھا؟[41]" ابن ہشام "[42] اور" طبری "[43] کی اس روایت کا کیا جواب ہے کہ ایک دن قریش نے رسول کی چادر سرِ عام پکڑ لی اور پوچھا کہ آپ ہمارے مذہب اور معبودوں کے بارے میں ایسی ایسی باتیں کہتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ ہاں ابن سعد نے

---

36 ۔ بلاذری، انساب الاشراف، ج1، ص159-158، 197-178؛ ابن ہشام، تہذیب سیرۃ ابن ہشام، ص2

37 ۔ دیکھیے: عنکبوت: 23-1، بروج: 10، قصص: 27، زمر: 10، نحل: 41، 110

38 ۔ محمد ایٹ مکہ، ص214-213

39 ۔ بلاذری، انساب الاشراف، ج1، ص116-115

40 ۔ ابن ہشام، تہذیب سیرۃ ابن ہشام، ص60-57

41 ۔ محمد بن جریر الطبری، تاریخ الطبری، مطبوعہ دار المعارف مصر، 1967ء، ج2، ص233-232؛ محمد بن سعد، طبقات ابن سعد، ج1، ص 141؛ ابن ہشام، تہذیب سیرۃ ابن ہشام، ص91-89؛ انساب الاشراف، ج1، ص336-335

42 ۔ تہذیب سیرۃ ابن ہشام، ص67-64؛ محمد بن سعد، طبقات ابن سعد، ج1، ص135

43 ۔ محمد ایٹ مکہ، ص235

بھی اس طرح کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔[44] واٹ کے نزدیک طبری اور ابن ہشام کی وہ روایت بھی مشکوک ہے جس کے مطابق میں بلائی رسول کے بارے میں آخری موقف اختیار کرنے کے لیے ایک مشاورتی مجلس بلائی گئی تھی۔ واٹ کا خیال یہ ہے کہ اس موقع پر محمد کو قتل کر دینے کے سلسلہ میں لوگوں میں اتفاق رائے نہ ہو سکا مگر یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ اس مشاورتی میٹنگ کے بعد ہی محمد ﷺ پر سنگ باری کی گئی ہو۔[45] واٹ اگر ایک طرف سیرت اور تاریخ کے مسلم واقعات میں شک کرتا ہے یا سرے سے ان کا انکار کر بیٹھتا ہے تو دوسری طرف ایسے واقعات اور نتائج فرض کر لیتا ہے جن کا سیرت اور تاریخ میں کوئی وجود نہیں۔ کمزور روایتوں کو صحیح ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور اس کے لیے بے سروپا باتوں کا سہارا لیتا ہے۔ اگرچہ وہ سیرت کے تانے بانے میں بالکل میل نہ کھاتے ہوں۔ قرآن کی جس آیت میں سجدہ تلاوت کو چھوڑنے پر تنبیہ کی گئی ہے۔[46] ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ کے بارے میں واٹ لکھتا ہے کہ محمد کے ساتھ ان کے تعلقات خادم اور مخدوم جیسے تھے۔[47] واٹ کا ایک مفروضہ یہ بھی ہے کہ شروع میں رسول اللہ نے مہاجرین حبشہ کو مدینہ واپس بلا لیا مقصد یہ تھا کہ اس چھوٹے سے گروہ کے بل پر مدینہ میں اپنی مرکزی پوزیشن کو طاقتور بنایا جائے۔[48] لیکن واٹ کو ان کی صحت پر اصرار ہے بلکہ اس کے نزدیک جو آیتیں توحید کی دعوت دیتی ہیں اور شرک سے دور رہنے کی تائید کرتی ہیں؛ جیسے یہ آیت: قل اندعو من دون الله ما لا ينفعنا ولا يضرنا و نرد على اعقابنا بعد اذ هدانا الله (انعام:71) آپ کہہ دیں کہ ہم خدا کے سوا ایسے کو پکاریں جو ہمیں نفع یا نقصان نہ پہنچا سکتا ہو اور ہم خدا کی ہدایت ملنے کے بعد روگردانی کر لیں۔[49] ان سے معلوم ہوتا تھا کہ ایک زمانہ تک محمد ﷺ مفاہمت کی بابت سوچتے رہے۔[50] اس قسم کے مفروضات اور نتائج سے ہم زیادہ بحث نہیں کریں گے کیونکہ ان کا تعلق استشراق اور قرآن سے زیادہ ہے۔"غار حرا میں پہلی وحی کے موقع پر فرشتہ کے اقرأ کے جواب میں آپ نے جو فرمایا اس کے لیے ما اقرأ ماذا اقرا اور ما انا بقاری کے الفاظ آتے ہیں۔ واٹ اس جگہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ رسول پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ حالانکہ ماذا اقرا ایک شاذ روایت ہے۔ اس کے برعکس بخاری میں ما انا بقاری کی صراحت موجود ہے۔[51]

---

[44] ۔ الانشقاق:12

[45] ۔ محمد ایٹ مکہ، ص221

[46] ۔ الاحقاف:32-29

[47] ۔ محمد ایٹ مکہ، ص167-166، 177-176

[48] ۔ الانعام:71

[49] ۔ محمد ایٹ مکہ، ص75

[50] ۔ ایضاً، ص75

[51] ۔ ایضاً، ص93

واٹ کا ایک مفروضہ یہ بھی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب سے اکتساب علم کیا تھا۔ ام المومنین حضرت خدیجہ نے ورقہ بن نوفل کے بہت سے اثرات قبول کیئے اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ محمد نے ان کے بہت سے خیالات قبول کیسے ہوں۔[52] واٹ کا کہنا ہے کہ ورقہ نے جس طرح محمد کی حوصلہ افزائی کی وہ اہمیت کا حامل ہے ناموس کے لفظ کے ساتھ منقول فقرہ بھی صحیح ہے یہ دراصل یونانی لفظ Nomos ہے جس سے مراد شریعت یا کتب مقدسہ ہیں۔ محمد نے ورقہ سے جو کچھ سنا اس سے انھیں خیال پیدا ہوا وہ ایک نئی امت کے بانی اور صاحب شریعت ہیں۔ مگر چونکہ وہ اپنے مزاج کی وجہ سے تذبذب کے شکار تھے اس لیے اپنے تجربات کی روشنی میں کوئی بڑا تعمیری قدم اٹھانے سے پہلے ورقہ کی حوصلہ افزائی کی ضرورت تھی۔ ان کے اندرونی انقلاب میں اس حوصلہ افزائی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔[53] یہ فرض کر لینا بہتر ہو گا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع ہی میں ورقہ سے تعلقات استوار کر لیے تھے اور ان سے بہت کی باتیں سیکھ چکے تھے۔[54] اس قسم کی ذہنی اختراعات اور خیال آرائیوں کی تردید کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایسے مزعومات ہیں جن کی تائید میں ایک بھی تاریخی روایت پیش نہیں کی جا سکتی۔ مستشرقین کی یہ عام روش رہی ہے کہ کسی طرح اہل کتاب سے اکتساب فیض کا ثبوت فراہم کیا جائے اگرچہ اس کے لیے بے حقیقت خیال آرائیوں کا سہارا لینا پڑے۔ قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے یعنی وحی اور توحید سارے نبیوں کی دعوت کا خلاصہ رہی ہے قرآن اور سابق صحیفوں میں اگر مشابہت موجود ہے تو اسی نوعیت کی ہے۔ قرآن نے اپنی بہت سی آیتوں میں تورات اور انجیل کی تحریفات کی صراحت کی ہے اور اس حقیقت کی نشاندہی کی ہے کہ ان کتابوں میں توحید کا پیغام انسانی آلائشوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔[55] واٹ نے خود اپنے ہم مشرب مستشرقین پر یہ گرفت کی ہے کہ ضرورت سے زیادہ اپنے تنقیدی ذوق کا سہارا لیتے ہیں اور ایسے اصول مقرر کرنا چاہتے ہیں جو غیر علمی انداز کے شکوک اور ذاتی رجحانات کو فروغ دے۔ واٹ اپنے آپ کو ان غلطیوں سے دور رکھنا چاہتا ہے۔[56]

درج بالا بحث سے یہ واضح ہوا کہ واٹ مغربی مستشرقین میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں اور ان کی Muhammad at Medina اور Muhammad at Mecca کاوشیں سیرت نگاری میں ایک نئے رجحان کا آغاز کرتی ہیں۔ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور مشن کو محض منفی تنقید یا تعصب کی بنیاد پر مسترد کرنے کے بجائے تاریخی و سماجی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی جو ایک مثبت پیش رفت ہے۔ ان کی تحریروں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلوص، اخلاقی عظمت اور

---

[52] ۔ سورہ نحل:103؛ یونس:37؛ انعام:92؛ بقرۃ:41، 89، 91، 97، 101؛ آل عمران:3، 81، 30؛ یوسف:111؛ احقاف:120، 30؛ نساء:47؛ مائدہ:46، 48؛ فاطر:31

[53] ۔ محمد ایٹ مکہ، ص8

[54] ۔ ایضاً، ص8

[55] ۔ ایضاً، ص9 (مقدمہ)

[56] ۔ ایضاً، ص9 (مقدمہ)

قائدانہ صلاحیتوں کا اعتراف بھی موجود ہے، جو انہیں سابقہ معاندانہ رویوں سے ممتاز کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے منہج اور نتائج میں متعدد کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ انہوں نے وحی کو ایک روحانی اور ماورائی حقیقت کے بجائے محض نفسیاتی یا سماجی و معاشی عوامل کا نتیجہ قرار دینے کی کوشش کی۔ نبوت کے اعلیٰ اور آفاقی پہلو کو محدود کر کے اسے تاریخی و مادی تناظر میں پیش کرنا دراصل ایک روحانی اور ماورائی حقیقت کے بجائے محض نفسیاتی یا سماجی و معاشی عوامل کا نتیجہ قرار دینے کی کوشش کی۔ نبوت کے اعلیٰ اور آفاقی پہلو کو محدود کر کے اسے تاریخی و مادی تناظر میں پیش کرنا دراصل ایک استشراقی تعصب کی عکاسی کرتا ہے۔ اسی طرح سیرت نبوی ﷺ کے کئی ایسے پہلو جن کا تعلق الہامی رہنمائی اور ربانی حکمت سے ہے، انہیں صرف سیاسی یا معاشرتی ضرورتوں کے تابع سمجھا گیا۔ یہ رویہ نہ صرف اسلامی تصور نبوت سے متصادم ہے بلکہ سیرت طیبہ ﷺ کے حقیقی پیغام کو بھی مسخ کرتا ہے۔

اس بحث کا ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اگرچہ واٹ کی کاوشیں مغربی علمی روایت میں ایک اعتدال کی کوشش کے طور پر دیکھی جاسکتی ہیں، لیکن وہ سیرت نبوی کے جامع اور صحیح فہم تک نہیں پہنچتیں۔ ان کی تحریروں میں بظاہر اعتدال کے باوجود استشراقی منہج کی جھلک واضح ہے۔ اس لیے ان کے افکار کا مطالعہ ہمیں ایک طرف مغربی علمی دنیا کے رجحانات سے آگاہ کرتا ہے تو دوسری طرف یہ ضرورت بھی اجاگر کرتا ہے کہ سیرت طیبہ کو داخلی (اسلامی) زاویے سے زیادہ مؤثر اور سائنٹیفک انداز میں پیش کیا جائے۔ آخر میں یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ سیرت نبوی کا اصل فہم اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسے وحی نبوت اور دین کے روحانی و آفاقی تناظر میں نہ سمجھا جائے۔ اسلامی محققین کی ذمہ داری ہے کہ وہ مغربی تحقیقات کا سنجیدہ تجزیہ کرتے ہوئے سیرت رسول ﷺ کے جامع اور حقیقی پہلوؤں کو علمی بنیادوں پر دنیا کے سامنے پیش کریں تاکہ استشراقی تعصبات کا ازالہ ہو اور سیرت النبی ﷺ کی عالمگیر و دائمی اہمیت پوری طرح اجاگر ہو سکے۔

مصادر و مراجع

القرآن

Margoliouth, Mohammed and The Rise of Islam، London, 1905۔

Montgomery Watt, Mohammed at Mecca، عربی ترجمہ: شعبان برکات، بیروت: المکتبۃ العصریۃ۔

William Muir, The Caliphate: Its Rise, Decline and Fall، London, 1891۔

ابن ہشام، تہذیب سیرۃ ابن ہشام، تحقیق: عبد السلام ہارون، قاہرہ، 1948ء۔

آرنلڈ، الدعوۃ الی الاسلام، ترجمہ: حسن ابراہیم حسن، القاہرہ، 1971ء۔

بروکلمان، تاریخ الشعوب الاسلامیہ، ترجمہ: فارس و بعلبکی، بیروت: دار العلم للملایین، 1968ء۔

بلاذری، انساب الاشراف، تحقیق: محمد حمید اللہ، قاہرہ: معہد المخطوطات لجامعۃ الدول العربیہ، 1959ء۔

جواد علی، تاریخ العرب قبل الاسلام، بغداد، 1916ء۔

ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ندوی، دراسات فی السیرۃ، بیروت، 1981ء۔

ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ندوی، علوم اسلامیہ اور مستشرقین، لاہور: میٹرو پرنٹرز، 2009ء۔

ڈاکٹر محمد ثناء اللہ ندوی، فصول فی المنہج والتحلیل، بیروت: المکتبۃ الاسلامیۃ، 1980ء۔

محمد بن جریر الطبری، تاریخ الطبری، قاہرہ: دار المعارف، 1967ء۔

محمد بن سعد البصری، طبقات ابن سعد، بیروت: دار الکتب العلمیہ، 1990ء۔

ولفنسن، تاریخ الیہود فی بلاد العرب فی الجاھلیۃ وصدر الاسلام، القاہرہ: مطبعۃ الاعتقاد، 1937ء۔